نجیب محفوظ اور عالمی منظر نامہ

ڈاکٹر سعید احمد ☆

Abstract:

Najeeb Mehfooz has introduced Egyptian literature with novel,before him Arab literature was all about stories and tales.He was brought up in a religious family of muslims but afterwards his religious ideas were changed.he has been on hit list of muslim fundamentalists.He was in favour of freedom of speech.His novels focused on the history of Egypt,later on he shifted to social and political issues.He insisted on Muslim identity but he admitted the fruitful mingling with West was also need of all times.His Nobel sspeech is a master peice as well which narrates history as well as present situation.

طلسم خواب زلیخا و دام بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

سرزمین مصر سے ہزاروں قصے منسوب ہیں یوسف زلیخا کا قصہ جسے قرآن مجید نے احسن القصص قرار دیا۔ پھر موسیٰ اور فرعون کا قصہ فراعنہ مصر اور اہرام کی پر اسرار کہانیاں۔ مذہب اور ساحری کے معر کے مٹی کی الواح پر لکھی حکایات لقمان' تحریر اور تہذیب کی داستانیں قدیم ارضِ نیل سے جدید مصر سویز تک کا سفر پانچ ہزار برس پرانا ہے سحر اور مقامہ کی روایات کے امین مصر کے بطل جلیل اور قاہرہ کی گلیوں کے داستان گو نجیب محفوظ کے حافظے میں ہزاروں قصے محفوظ ہیں۔

نجیب محفوظ کا شمار عرب دنیا کے عظیم ترین ناول نگاروں میں ہوتا ہے نجیب سے پہلے عربی ادب میں پرانی طرز کی کہانیاں اور داستانیں رائج تھیں۔ مصر میں ناول نگاری کا آغاز انگریزوں اور فرانسیسیوں کے عہد میں ہوا۔ زاہدہ حنا اپنے ایک مضمون 'نجیب محفوظ، ایک نابغہ روزگار' میں لکھتی ہیں:

> "عربی ادب میں ناول ایک نئی صنف ہے۔ اُردو کی طرح عربی میں بھی ناول کا آغاز تمثیلی قصوں سے ہوا۔ فرانسیسی اور انگریزی ادب کے زیر اثر نئے ادبی رجحانات نے عربی ادب میں

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

> تیزی سے جگہ بنائی اور۱۹۱۳ء میں محمد حسین ہیکل نے پہلا ناول 'زینب' لکھا جو آنے والوں کے لیے رہنما بنا۔ دیہات سے تعلق رکھنے والی اِس ہیروئن 'زینب' کا قصہ خالص رومانی خدوخال رکھتا ہے اور یہیں سے حسین ہیکل کے بعد آنے والے ناول نگاروں نے اپنی راہیں نکالیں، ان میں طٰہٰ حسین، ابراہیم المرینی، عباس العکاد، خلیل جبران، مصطفیٰ لطفی المنفلوطی اور توفیق الحکیم کے نام شامل ہیں۔" [۱]

نجیب محفوظ نے عربی ناول کی اِس نئی صنف کو وہ اعتبار اور وقار بخشا کہ ۱۹۸۸ء میں انھیں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ نجیب محفوظ کی شہرت اور عظمت کی بدولت عربی ادب کو ایک نئی شناخت ملی اور بہت سے عرب ادیبوں کی تصانیف کے دُنیا بھر کی بڑی زبانوں میں ترجمے ہونے لگے۔ خود نجیب محفوظ کے بہت سے ناول ۲۴ سے زائد زبانوں سے ترجمہ ہو چکے ہیں اور یہ تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ نجیب کے ناولوں کی مقبولیت کا ایک راز یہ ہے کہ وہ قدیم مصر سے جدید قاہرہ تک کی تہذیب اور تاریخ سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ نہ صرف الف لیلہ و لیلہ کی طرز کے تخیلاتی افسانے لکھتا ہے بلکہ جدید عصری مسائل اور سیاسی و سماجی وقائع نگاری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

نجیب محفوظ کے مذہبی، سیاسی اور سماجی خیالات اور نظریات ان کی تصانیف میں صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ نجیب محفوظ کے افکار کو بہتر طور پر جاننے کے لیے ان کے احوال و آثار کا بیان مفید ہو گا۔

نجیب محفوظ ۱۱؍دسمبر ۱۹۱۱ء کو قاہرہ کے ایک نئی بستی العباسیہ منتقل ہو گئے۔ محفوظ کے والد سرکاری ملازم تھے اور محفوظ بھی آخر کار انہیں کے نقشِ قدم پر چل نکلے۔ نجیب محفوظ کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں نجیب کی والدہ اُسے اکثر عجائب گھر اور دیگر تاریخی مقامات پر لے جاتی۔ بعد ازاں یہی باتیں ان کے ناولوں کے بنیادی موضوعات قرار پائیں۔ نجیب محفوظ کا خاندانی پس منظر خالص مذہبی تھا اور اس نے ابتدائی تعلیم بھی مکتب اور مدرسے سے حاصل کی لیکن بعد میں نجیب محفوظ کے مذہبی خیالات میں بڑا تغیر نظر آتا ہے۔

۱۹۱۹ء کے مصری انقلاب نے نجیب محفوظ کو بے حد متاثر کیا اگرچہ یہ نجیب کے بچپن کا زمانہ تھا لیکن اس انقلاب کے دیرپا اثرات اس کے قلب و ذہن پر نقش ہو گئے۔ ثانوی درجے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نجیب نے کنگ فواد یونی ورسٹی (موجودہ نام قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۳۶ء میں ایم اے کرنے کے بعد نجیب محفوظ نے ادیب بننے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ نجیب نے بطور صحافی اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا اور الرسالہ، الہلال اور الاہرام جیسے اخبارات سے وابستہ رہے۔ نجیب محفوظ نے اس عرصہ میں سوشلسٹ نظریات سے خاصا اثر قبول کیا۔ ادبی اور صحافتی میدان کو چھوڑ کر نجیب محفوظ نے وزارتِ مذہبی امور میں نوکری کر لی لیکن اپنے مخصوص نظریات کے باعث انہوں نے جلد ہی اس نوکری کو بھی خیرباد کہا اور وزارتِ ثقافت میں فرائض سرانجام دینے لگے یہیں نجیب محفوظ کا فلم انڈسٹری سے تعلق پیدا ہوا اور نجیب محفوظ نے طویل پیشہ ورانہ زندگی کے دوران میں ۳۴ ناول، ۳۵۰ افسانے درجنوں فلم اسکرپٹس اور ڈرامے لکھے۔ ان کی تصانیف پر متعدد عربی فلمیں بنائی گئیں۔ نجیب محفوظ نے مختلف اعلیٰ انتظامی عہدوں پر کام کیا، ۱۹۷۲ء میں وزارتِ ثقافت سے ریٹائرڈ

ہوکر دارالمعارف اشاعتی گھر کے بورڈ ممبر بن گئے۔ نجیب کے بیشتر ناول الاہرام میں قسط وار چھپتے رہے۔ علاوہ ازیں وہ الاہرام میں اپنے ہفتہ وار کالم 'نقطۂ نظر' میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

نوبل انعام پانے سے پہلے ان کے صرف چند ناول مغرب میں ترجمہ ہوئے تھے۔ نجیب محفوظ نے ۴۳ سال کی عمر میں شادی کی۔ انہوں نے تاخیر سے شادی کرنے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ شادی اور دیگر خانگی مصروفیات ان کے لکھنے لکھانے کے کام کو متاثر کریں گی۔ نجیب نے ایک مصری خاتون سے شادی کی جن سے دو بیٹیاں ہوئیں۔ نجیب کو اپنے سیاسی نظریات کے باعث بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ نجیب نے انور سادات کے اسرائیل سے کیمپ ڈیوڈ امن معاہدے کی بھرپور حمایت کی جس کے باعث عرب دُنیا میں ان کی تصانیف پر پابندی عائد کر دی گئی جو ۱۹۹۸ء نوبل انعام پانے تک برقرار رہی۔ بہت سے مصری ادیبوں اور دانشوروں کی طرح نجیب محفوظ بھی

اسلامی بنیاد پرستوں کی 'ڈیتھ لسٹ' پر رہے نجیب محفوظ نے سلمان رشدی کیس میں آیت اللہ خمینی کے فتویٰ کی مخالفت کی نجیب نے خود بھی سلمان رشدی کی 'شیطانی آیات' (Satanic verses) پر کڑی تنقید کی لیکن وہ اظہار کی آزادی کے حق میں تھے اور سمجھتے تھے کہ خمینی کا فتویٰ اسلامی روحِ عدل کے منافی تھا۔ نجیب محفوظ کے ناول ''جبلاوی کے بچے'' (Children of Geblawi) پر مصر کے مذہبی حلقوں میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور مشہور نابینا عالم دین شیخ عمر عبدالرحمٰن نے انہیں واجب القتل قرار دے دیا۔

۱۹۹۴ء میں نجیب محفوظ پر دو مذہبی انتہاپسندوں نے تیز دھار چاقوؤں سے قاتلانہ حملہ کر دیا نجیب کی گردن پر کاری زخم لگے۔ وہ موت سے تو بچ نکلے لیکن کچھ عرصہ تک دائیں ہاتھ سے قلم پکڑنے کی سکت نہ رہی۔ اس معذوری اور دُکھ کا اظہار انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں کیا ہے مثلاً 'قلم' اور 'مصنف کا املا کروانا' وغیرہ۔

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے، روایتوں سے مجھے

اِس حادثے کے بعد نجیب محفوظ کی فعالیت بے حد متاثر ہوئی ان پر پژمردگی اور یاسیت طاری ہوگئی۔ عمر کے آخری حصے میں ان کی بصارت اور سماعت کی قوتیں بھی کمزور پڑ گئیں۔ وہ السر کے مریض تھے، نجیب نے ۹۴ سال کی عمر میں ۳۰/اگست ۲۰۰۶ء کو قاہرہ میں وفات پائی۔ نجیب محفوظ کی میت کو فوجی اعزاز اور احترام کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ نجیب نے ایک دفعہ خواب دیکھا تھا کہ اُس کے جنازے میں مصر کے تمام اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کے لوگ شامل ہیں۔

نجیب محفوظ کی ابتدائی تحریریں جمالیہ (۱۹۶۴ء سے قبل) کی یادگار ہیں نجیب کے ابتدائی ناولوں کے موضوعات کا تعلق مصر کی قدیم تاریخ سے ہے انہوں نے ابتدا میں مصر کی تمام تر تاریخ کو ۳۰ ناولوں کے ایک سلسلے میں قلم بند کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اس سیریز کے صرف تین ناول ہی معرضِ تحریر میں آئے۔ ان تین ناولوں کے نام یہ ہیں۔

عبث الاقدار (۱۹۳۹)، رادوبیس (۱۹۴۳) اور 'کفائے طیبۂ' نجیب کے ان تاریخی ناولوں پر سر والٹر اسکاٹ

کے اثرات نمایاں ہیں بعد ازاں انہیں قدیم تاریخ کی بجائے معاصر تاریخ اور معاشرتی و سماجی تبدیلیوں کے عام لوگوں کی زندگیوں پر نفسیاتی اثرات جیسے موضوعات مرغوب خاطر رہے ہیں۔

نجیب کے شاہکار ناول وہ ہیں جنہیں ثلاثہ قاہرہ (Cario Trilogy) کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلے اس کام کو نجیب محفوظ نے جولائی ۱۹۵۲ء انقلاب سے پیشتر مکمل کیا ان تین ناولوں کے نام 'محل کی سیر'، 'خواہشوں کا محل'، اور 'شکر گلی' تھے۔ ان ناولوں کا لوکیل قاہرہ کی وہ گلیاں ہیں جہاں نجیب پلا بڑھا۔ ایڈورڈ سعید (Cario Trilogy) کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یہ سہ شاخہ بزرگ (پیٹر یارک) السید احمد عبدالجواد اور تین نسلوں پر محیط، ان کے خاندان کی تاریخ ہے۔ سیاسی اور سماجی تفصیلات کی وافر مقدار فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ، یہ مرد و زن کے نجی تعلقات کا مطالعہ بھی ہے اور ایمان کی تلاش میں احمد عبدالجواد کے چھوٹے بیٹے کمال کی اُس جستجو کا احوال بھی جو اپنے مذہب اسلام کی تبلیغ کے ایک ابتدائی اور قبل از وقت مختصر ہو جانے والے مرحلے کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔''[۲]

ثلاثہ قاہرہ عرب دُنیا میں بے حد مشہور ہوئے بہت سی فلمیں بنائی گئیں۔ اس کے انگریزی تراجم ہوئے اور صرف امریکہ میں اس کی ڈھائی لاکھ جلدیں فروخت ہوئیں۔ Cairo Trilogy کے ناول سماجی حقیقت نگاری کے معراج سمجھے جاتے ہیں اور ان ناولوں کی اشاعت کے بعد نجیب محفوظ کا شمار بالزاک، ڈکنز، ٹالسٹائی اور گالزوردی جیسے ممتاز ناول نگاروں میں ہونے لگا۔

۱۹۵۲ء میں شاہ فاروق کے معزول ہونے کے بعد جمال عبدالناصر کے دورِ حکومت کے آغاز میں نجیب محفوظ کے لکھنے لکھانے کا کام تعطل کا شکار ہوگیا۔ یہ جمود ۱۹۵۹ء کے بعد ٹوٹا اور نجیب محفوظ نے بڑی تیزی سے ناول افسانے، صحافیانہ تحریریں، یادداشتیں مضامین اور ڈرامے لکھے۔ 'سیر نیل' ۱۹۶۶ء (Chiltchat on the Nile) کا شمار نجیب محفوظ کے مقبول ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ اِس ناول میں جمال عبدالناصر کے دورِ حکومت میں مصری معاشرے پر کڑی تنقید کی گئی ہے صدر انور سادات کے دور میں اس ناول پر پابندی عائد کر دی گئی کیونکہ مصری عوام جمال عبدالناصر کو بطل حریت سمجھتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ نجیب نے اس دور میں سوشلزم، ہم جنس پرستی اور الٰہیات جیسے متعدد موضوعات پر ناول لکھے یہ وہ موضوعات تھے جو اس وقت مصر میں بے حد متنازعہ سمجھتے جاتے تھے۔

نجیب محفوظ کا سب سے ہنگامہ خیز ناول گبلاوی کے بچے (Children of Gibelawi) کے عنوان سے ہے۔ یہ ناول مصر سمیت تمام عرب دُنیا میں ناقابل اشاعت قرار دے دیا گیا۔ نجیب محفوظ ایک بے باک سماجی حقیقت نگار تھے۔ فکشن میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ صحافت میں بھی نجیب محفوظ نے ہمیشہ سچ بات لکھنے میں کبھی خوف محسوس نہیں کیا۔ نوم چومسکی اور ایڈورڈ سعید جیسے معاصر دانشوروں کی طرح نجیب محفوظ بھی امریکہ کی توسیع پسندانہ اور غاصبانہ پالیسیوں کے سخت گیر نقاد تھے۔ وہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے ذرائع ابلاغ کا محاکمہ

الاہرام میں اپنے ہفتہ وار کالم نقطہ نظر میں کرتے رہے۔

نجیب اپنے ایک کالم 'طاقت اور انصاف' میں لکھتے ہیں:

> ''تنہا طاقت سلامتی کی ضمانت نہیں۔کوئی خواہ نوعِ انسان کی تاریخ میں اعلیٰ ترین ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ مفید المثال ہتھیاروں کا مالک کیوں نہ ہو۔جن میں ایٹمی، جراثیمی، کیمیادی اور ایسے دیگر ہتھیار شامل ہوں۔جن کے بارے میں ہم نے اب تک کچھ نہیں سنا ہے۔پھر بھی وہ ایک خوفناک ضرب کا شکار ہو سکتا ہے۔سلامتی کی واحد ضمانت انصاف ہے ورنہ تنگ آمد بجنگ والا معاملہ چلتا رہے گا۔نا انصافی کے خاتمے ہی سے دہشت گردی کا خاتمہ ممکن ہے ایک پرانی عرب کہاوت ہے۔حکمرانی کی روح انصاف ہے۔صرف انصاف ہی کی بدولت امریکا دنیا پر بہتر حکومت کر سکتا ہے۔''[۳]

نجیب محفوظ کہتے ہیں:

اُس وقت جب کہ امریکی برطانوی رُخ،مغربی برہمی کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب ایک کٹر دشمن ہے یا کم از کم یہ کہ ہم مغرب کے ساتھ ناخوشی گوار تعلقات کے حامل ہیں۔

سچائی تو یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ہم مغرب کے ساتھ لازماً تصادم کی حالت میں ہیں ہم ایسے ادوار سے گزرے ہیں جب نوآبادیاتی مغرب کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے اور ان حالات میں مغرب کے خلاف جنگ کرنا آزادی کے لیے قومی جدوجہد کا ایک حصہ تھا لیکن یہ بات بھی مساوی اہمیت کی حامل ہے کہ مغرب نے ایک ثقافتی ماڈل کا کردار ادا کیا ہے۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم لازماً اپنی روایات اور طور طریقوں کو چھوڑ کر مغرب کی روایات اور طور طریقوں کو اپنا لیں۔

میں اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا جس میں یہ کہا گیا ہے کہ تہذیب ہماری تہذیب کے بالکل برعکس ہے یا یہ کہ ایک نئے ثقافتی نوآبادیاتی نظام سے مقابلہ کرنے کی غرض سے ہمیں اپنے آپ کو لازماً الگ تھلگ کر لینا چاہیے۔ثقافت اقتدار کی اسی قسم کی جنگوں کے دائرے سے باہر کی چیز ہے اور اس حقیقت نے کہ ہم ساری تاریخ کے دوران مشرقی اور مغربی ثقافتوں کے حملے کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ہماری شکل وصورت کے تمول میں اضافہ ہی کیا ہے اور نشاۃ ثانیہ کے ادوار کو جنم دیا ہے۔

اپنی تہذیب سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مغربی ثقافت سمیت دوسری ثقافتوں کے مثبت اثرات کو قبول کرنے کے لیے تیار رہیں۔

نوبیل انعام کا خطبہ:

خواتین وحضرات!

آغازِ کار میں، میں سب سے پہلے سویڈش اکیڈمی اور اِس کی نوبیل کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انہوں

نے میری طویل اور مستقل مزاج کوششوں کی طرف توجہ دی اور میں چاہوں گا کہ آپ میری گفتگو کو رواداری کے ساتھ سنیں۔ اِس لیے یہ گفتگو ایسی زبان میں ہے جو آپ میں سے اکثر کے لیے نامعلوم ہے لیکن اِس انعام کی اصلی حق دار وہی ہے لہٰذا اِس لیے یہ ہونا ہی تھا کہ اس کے ترانے پہلی بار آپ کی تہذیب وتمدن کے اِس نخلستان میں موج زن ہوں۔ مجھے بڑی اُمیدیں ہیں کہ یہ آخری بار نہ ہوگا اور میری قوم کے ادبی مصنف یہ لطف وانبساط حاصل کریں گے کہ آپ کے برابر، پوری اہلیت واعزاز کے ساتھ بین الاقوامی ادیبوں کے ہمراہ بیٹھیں گے جنھوں نے ہماری اِس دُکھوں کی ماری دُنیا میں مسرت و دانش کی خوشبو پھیلائی ہے۔

مجھے قاہرہ میں ایک غیر ملکی نامہ نگار نے بتایا کہ جس دم اِس انعام کے حوالے سے میرا نام لیا گیا، خاموشی چھا گئی اور بہت سے لوگ حیران ہو گئے کہ یہ کون ہے۔ پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے آپ کو اِس قدر معروضی طور پر پیش کروں کہ جس حد تک ایک انسان کے لیے ممکن ہے۔ میں دو تہذیبوں کا فرزند ہوں کہ جن میں تاریخ کے ایک مخصوص دور میں ایک خوشگوار مناکحت عمل میں آئی۔ ان میں سے پہلی تہذیب، سات ہزار پرانی مصر کی دورِ فراعنہ کی تہذیب ہے اور دوسری چودہ سو برس پرانی، اسلامی تہذیب ہے۔ مجھے غالباً آپ کے سامنے ان دونوں میں سے کسی کا بھی تعارف کرانے کی ضرورت نہیں کہ آپ اہل علم ہیں، دُنیا کے اشراف میں سے ہیں لیکن ہمارے تعارف اور ارتباط کے اِس مرحلے میں محض ایک یاددہانی میں کوئی حرج نہیں۔

جہاں تک فراعنہ مصر کی تہذیب کا تعلق ہے، میں فتوحات اور سلطنت کی تعمیر کا ذکر نہیں کروں گا۔ یہ گھسے پٹے فخر کی بات بن کر رہ گئی ہے جس کے ذکر پر دورِ جدید کا ضمیر، خدا کا شکر ہے کہ بے چین ہو جاتا ہے۔ نہ میں یہ ذکر چھیڑوں گا کہ کس طرح پہلی بار اُس نے خدا کے وجود کی طرف رہنمائی حاصل کی اور انسانی شعور کے طلوع کا نقیب ثابت ہوا۔ اِس کی تاریخ بہت طویل اور آپ میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو پیغمبر و بادشاہ آکناتون سے واقف نہ ہو۔ میں ادب وفن میں اِس تہذیب کی کامیابیوں کا بھی ذکر نہیں کروں گا اور نہ اِس کے شہرۂ آفاق معجزوں کا: اہرام، ابو الہول اور کارناک۔ کیوں کہ جن لوگوں کو ان یادگاروں کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے، انہوں نے اِن کے بارے میں پڑھا ہے اور ان کی صورت وشکل پر غور کیا ہے۔

لہٰذا مجھے اجازت دیجیے کہ فراعنہ مصر کی تہذیب کو اِس چیز کے ذریعے سے متعارف کراؤں جو کہانی سے ملتی جلتی ہے، اِس لیے کہ میرے ذاتی حالات نے میرے مقدر میں لکھ دیا کہ میں کہانی سنانے والا بن جاؤں۔ تو پھر دستاویزات میں یہ تاریخی واقعہ درج ہے: پرانے مخطوطوں میں بیان کیا گیا ہے کہ فرعون کے علم میں آگیا کہ اِس کے حرم کی چند عورتوں اور اس کے دربار کے چند مردوں کے درمیان گناہ کا رشتہ قائم ہوگیا ہے۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ اپنے دور کے مزاج کے مطابق وہ ان کا خاتمہ کر ڈالے گا لیکن اس نے، اس کے برخلاف، قانون کے منتخب روزگار لوگوں کو سے کہا کہ وہ 'سچ' سننا چاہتا ہے تاکہ 'انصاف' کے ساتھ فیصلہ صادر کر سکے۔

یہ طرزِ عمل، میری رائے میں، کسی سلطنت کی بنیاد ڈالنے یا اہرام کی تعمیر کرنے سے زیادہ بڑا ہے۔ یہ شان و شوکت اور دولت سے بڑھ کر اس تہذیب کی برتری کا ثبوت ہے۔ اب یہ تہذیب رُخصت ہوئی ___ ماضی کا افسانہ

ہوکر رہ گئی۔ایک دن یہ عالی شان اہرام بھی غائب ہو جائیں گے۔مگر 'سچ' اور 'انصاف' اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک کہ بنی نوع انسان کے پاس سوچنے والا دماغ اور زندہ ضمیر موجود ہے۔

جہاں تک اسلامی تہذیب کا تعلق ہے، میں اِس کی دعوت کا ذکر نہیں کروں گا کہ خدا کی نگہبانی میں، تمام انسانیت کے درمیان ایک رشتہ قائم ہو جائے گا جو آزادی، مساوات اور عفو و درگزر پر مبنی ہو اور نہ میں اس کے پیغمبر کی عظمت کا ذکر کروں گا کیوں کہ آپ کے مفکرین کے درمیان ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جو ان کو تاریخ کا سب سے بڑا آدمی گردانتے ہیں۔ میں اِس کی ان فتوحات کا بھی ذکر نہیں کروں گا جنھوں نے ہندوستان اور چین کے نواح سے لے کر فرانس کی سرحدوں تک ہزاروں مینار ایستادہ کر دیے جو نماز کے لیے، نیکی کے لیے اور پرہیز گار کے لیے بلاتے ہیں۔ نہ میں اس اخوت کا ذکر کروں گا جو مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان اس کی آغوش میں، رواداری کے ایسے جذبے کے ساتھ قائم ہوگئی جس کی مثال بنی نوع انسان کے سامنے اس سے پہلے تھی اور نہ اس کے بعد آئی ہے۔

اس کے بجائے میں اس تہذیب کا تعارف ایک متاثر کن، ڈرامائی صورتِ حال کے ذریعے سے کروں گا جو اس کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ایک کو اُجاگر کرتی ہے: بازنطینیوں کے خلاف ایک فتح مندانہ جنگ میں اس نے ان کے جنگی قیدیوں کو چھوڑ دیا اور ان کے بدلے میں قدیم یونانیوں کے ورثے کی وہ کتابیں مانگ لیں جو ان کے پاس موجود تھیں اور جو فلسفہ، طب اور ریاضی کے موضوعات پر تھیں۔ یہ روحِ انسانی کی اس قدر و قیمت کی شہادت ہے جو علم کی طلب میں رہتی ہے، حالانکہ طلب کرنے والے خدائے واحد کے پیروکار تھے اور جو طلب کیا گیا وہ ملحد تہذیب کا ثمرہ۔

میرا مقدر تھا، خواتین وحضرات کہ ان دو تہذیبوں کی آغوش میں پیدا ہوں ان کا دودھ پیوں، ان کے ادب و فن سے نشوونما پاؤں۔پھر اس کے بعد میں نے آپ کے پُر مایہ اور مسحور کن تمدن کا امرت پیا۔اس سب کے محرکات سے ـــــ اور اپنے اضطراب سے ـــــ الفاظ میرے منہ سے شبنم کی طرح جھڑکنے لگے۔ان الفاظ کی خوش نصیبی تھی کہ آپ کی معزز اکیڈمی کی تحسین حاصل کی جس نے میری کاوشوں کو نوبیل انعام کا تاج پہنایا۔ بہت شکریہ ان کا میرے نام سے اور رُخصت ہو جانے والے ان معماروں کے نام سے جنھوں نے ان دو تہذیبوں کی بنیا ڈالی۔

خواتین وحضرات!

آپ ضرور حیران ہو رہے ہوں گے: یہ شخص جو تیسری دنیا سے آیا ہے، اسے بھلا وہ دماغی سکون کہاں سے میسر آیا کہ کہانیاں لکھنے لگا؟ آپ کی بات بالکل دُرست ہے۔ میں اِس دنیا سے آیا ہوں جو قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اور جن کو ادا کرنے میں فاقے کی نوبت آجاتی ہے، یا اس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔اس کے بعض لوگ سیلاب سے مرجاتے ہیں اور بعض دوسرے، افریقہ میں فاقہ کشی سے۔جنوبی افریقہ میں لاکھوں افراد ٹھکرائے جانے اور انسانی حقوق کے اس دور میں تمام انسانی حقوق سے محرومی کا شکار ہوکر مارے گئے۔گویا وہ انسانوں میں شمار کیے جانے کے لائق نہ ہوں۔مغربی کنارے اور غزہ میں ایسے لوگ ہیں جو کھوئے گئے۔حالاں کہ وہ اپنی زمینوں پر رہ

رہے ہیں، اپنے باپ دادا کی زمین، باپ دادا کے بھی باپ دادا کی زمین۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اپنا حق مانگنے کے لیے حالانکہ یہ پہلا حق تھا جو قدیم انسان نے اپنے لیے حاصل کیا، یہ حق کہ ان کے پاس ایسی جگہ ہو جسے دوسرے لوگ بھی جان سکیں گے کہ یہ جگہ ان کی ہے۔ اس دلیرانہ حرکت کا صلہ انہیں یہ ملا ــــــ مرد، عورتیں، نوجوان اور بچے، سبھی کو ــــ کہ ان کی ہڈیاں توڑی گئیں، ان کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، ان کے گھر مسمار کیے گئے، ان کو قید خانوں میں اذیت رسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے چاروں طرف ۱۵۰ ملین عرب ہیں جو غم و غصے کے ساتھ حالات کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یہ علاقے کے لیے بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے، اگر ان لوگوں کی دانشوری نے صورتِ حال کو بگڑنے سے نہ بچا لیا جو مبنی بر انصاف اور مکمل امن کے خواہش مند ہیں۔

جی ہاں، تیسری دنیا سے آنے والے ایک آدمی کو افسانے لکھنے کے لیے ذہنی سکون کہاں سے میسر آ گیا؟ خوش قسمتی سے فن، مائل بہ کرم اور ہم درد و غم گسار ہے۔ جس طرح وہ خوش باش لوگوں کا ساتھ دیتا ہے، اسی طرح وہ فلاکت زدوں کا ساتھ بھی نہیں چھوڑتا۔ یہ دونوں ہی کو پُر سہولت ذرائع فراہم کرتا ہے کہ سینے میں جو کچھ اُمڈ رہا ہے، اسے ظاہر کر سکیں۔

تہذیب کی تاریخ کے اِس فیصلہ کن لمحے میں، یہ ناقابل فہم اور ناقابل قبول ہے کہ انسانیت کی کراہیں خلا میں گونجتی رہ جائیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ بنی نوع انسان آخر کار بلوغت کی عمر کو پہنچ چکی ہے اور ہمارا عہد بڑی طاقتوں کے درمیان مفاہمت کی توقعات لیے ہوئے آیا ہے۔ انسانی ذہن اب تباہی اور غارت گری کے تمام اسباب کے خاتمے کی کاوش سے عہدہ برآ ہونے کا منصب سنبھال رہا ہے اور جس طرح سائنس دان اس بات کے لیے دن رات ایک کیے دے رہے ہیں کہ ماحول سے صنعتی آلودگی کو یکسر پاک کر دیں گے، دانش وروں کو دن و رات ایک کر دینا چاہیے کہ انسانیت سے اخلاقی آلودگی کو یکسر پاک کر دیں گے۔ یہ ہمارا حق بھی ہے اور فریضہ بھی کہ تہذیب یافتہ ملکوں کے بڑے بڑے رہنماؤں سے اور ان کے ماہرین معاشیات سے مطالبہ کریں کہ اِس حقیقی جست میں مدد کریں جو ان کو اس عہد کے مرکز میں لا کر رکھ سکے۔

پرانے زمانوں میں ہر رہنما صرف اور صرف اپنی قوم کی فلاح کے لیے کام کرتا تھا۔ باقی تمام کو مخالف یا پھر استحصال کے لائق سمجھا جاتا تھا۔ برتری اور ذاتی شان و شوکت کے علاوہ کسی اور قدر کی طرف توجہ نہ تھی۔ اس کی خاطر کتنے بہت سے تصورات، اخلاق و ضوابط اور قدریں پامال ہوئیں، غیر اخلاقی طریقوں کو حق بجانب قرار دیا گیا، ان گنت جانیں موت کے گھاٹ اُتار دی گئیں۔ جھوٹ، دھوکا دہی، فریب، ظلم و ستم کی حکمرانی رہی اور وہ بھی دانشوری کی نشانی اور عظمت کے ثبوت کے طور پر۔ آج اس تصور کو جڑ سے ہی بدل ڈالنے کی ضرورت ہے۔ آج کسی تہذیب یافتہ رہ نما کی عظمت کی پیمائش کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ تمام بنی نوع انسان کے لیے اس کی بصیرت اور احساسِ ذمہ داری کتنا ہے۔ ترقی یافتہ دنیا اور تیسری دنیا ایک ہی خاندان ہیں۔ ہر ایک انسان اس کے سامنے اس حد تک یہ ذمہ داری رکھتا ہے کہ کس درجے دانش، علم اور تہذیب حاصل کی ہے۔ میں اپنے فرائض کی حدود سے تجاوز نہیں کروں گا اگر تیسری دُنیا کے نام پر ان سے کہوں: ہماری مصیبت کے محض تماشائی نہ بنے رہیے۔ آپ کو اپنے منصب

کے مطابق اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ برتری کے درجے پر فائز ہو کر آپ پر پودے اور ہر حیوان کے ساتھ بدسلوکی کے ذمہ دار ہیں، انسان کا تو خیر ذکر ہی کیا، چاہے دُنیا کے کسی بھی کونے میں کی جائے۔ الفاظ بہت ہو گئے، اب عمل کا وقت ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ لٹیروں اور منافع خوروں کا دور ختم کیا جائے۔ ہم ان رہنماؤں کے دور میں ہیں جن کے کاندھوں پر ساری دنیا کی ذمہ داری ہے۔ جنوبی افریقہ میں غلام بن جانے والوں کو بچالو! افریقہ کے بھوکوں کو بچالو! فلسطینیوں کو گولیوں کی بوچھاڑ سے اور اذیت رسانی سے محفوظ کرلو! یہی نہیں، اسرائیلیوں کو بچا لو اپنے عظیم روحانی ورثے کو داغ دار نہ ہونے دیں! قرض کے بوجھ تلے دبے ہوؤں کو معیشت کے بے رحم قوانین سے بچالو! ان کی توجہ اس طرف منعطف کرالو کہ انسانیت کے سامنے ان کی ذمہ داری، اس سائنس سے ان کی وابستگی سے پہلے آتی ہے جس کو شاید وقت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

میں معذرت خواہ ہوں، خواتین وحضرات، میں سمجھتا ہوں کہ شاید میں نے آپ کے سکون کو کسی حد تک درہم برہم کر دیا ہے لیکن آپ کو تیسری دنیا سے آنے والے سے اور کیا توقع ہے؟ ہر طرف پر اس مشروب کا رنگ چڑھ جاتا ہے جو اس میں بھرا جاتا ہے اور پھر انسانیت کی کراہوں کو گونجنے کے لیے اور کوئی جگہ کہاں ملے گی؟ آپ کے اس نخلستان تہذیب کے سوا، جس کی بنیاد اس کے بانی نے سائنس، ادب اور اعلیٰ انسانی اقدار کی خدمت کی غرض سے رکھی تھی اور جس طرح اس نے اپنی دولت کو نیکوکاری کے لیے مختص کر دیا تھا، اِس اُمید پر کہ اسے معافی حاصل ہو جائے، اِسی طرح، ہم تیسری دنیا کے بچے یہ مطالبہ کرتے ہیں ان سے جو اہلیت رکھتے ہیں، جو تہذیب یافتہ ہیں کہ اس کی مثال پر چلیں، اس کی روش کو اپنے اندر جذب کریں اور اس کی بصیرت پر غور کریں۔

خواتین وحضرات!

ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے باوجود میں آخری دم تک اُمید کا دامن پکڑے رہوں گا۔ میں کانٹ کی طرح یہ نہیں کہتا کہ نیکی کو فتح حاصل ہوگی تو اگلی دنیا میں۔ نیکی ہر روز فتوحات حاصل کر رہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بدی ہمارے تصور سے زیادہ کم زور ہو۔ ہمارے سامنے نا قابل تردید ثبوت ہے: اگر یہ حقیقت نہ ہوتی کہ فتح ہمیشہ نیکی کی ہوتی ہے تو انسانوں کے بھٹکتے ہوئے غول، حیوانوں اور حشرات الارض، قدرتی آفات، خوف اور تکبر کے باوجود بڑھنے اور پھیلنے کے قابل نہ ہوتے۔ پھر ایسا نہ ہوتا کہ وہ قدموں کی بنیاد رکھیں، تخلیق اور ایجاد میں مہارت حاصل کریں، خلا کی تسخیر کریں اور انسانی حقوق کا اعلان کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ بدی، فل غیاڑہ مچانے والی فاسق ہے اور انسان کو یہ زیادہ یاد رہتا ہے کہ کس چیز نے دل کو دُکھ دیا یہ نسبت اس کے، جس سے خوشی حاصل ہوئی۔ ہمارا عظیم شاعر ابوالعلا المعری بالکل دُرست تھا جب اس نے کہا:

موت کی گھڑی کا دُکھ
سوگنا زیادہ ہے
پیدائش کے لمحے کی خوشی سے۔

آخر میں، میں اپنے شکریہ کا دوبارہ اظہار کرتا ہوں اور آپ سے معذرت کا خواستگار رہوں۔

حوالہ جات:

۱۔ زاہدہ حنا: ''نجیب محفوظ: ایک نابغہ روزگار''، مشمولہ: **دُنیا زاد**، شمارہ ۱۸، کراچی، ص ۲۶۵۔

۲۔ ایڈورڈ سعید: ''نجیب محفوظ''، مشمولہ **دُنیا زاد** شمارہ ۱۸، کراچی: مترجمہ آصف فرخی، ص ۲۵۳۔

۳۔ نجیب محفوظ: ''طاقت اور انصاف''، مشمولہ: **دُنیا زاد**، شمارہ نمبر ۲، کراچی: مترجمہ، انوار احسن صدیقی، ص ۱۱۔